خطبۂ صدارت

ریاستی، دینی، تعلیمی کانفرنس، لکھنؤ

منعقدہ ۲۲-۲۳ جون سنہ ۱۹۷۵ء

از

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

صدر دینی تعلیمی کونسل (یو-پی)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو — عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق — سامانِ صد ہزار نمکداں کئے ہوئے

حضرات! ریاستی دینی تعلیمی کانفرنس کے اسٹیج سے خطبۂ صدارت کے عنوان اور پیرایۂ بیان میں آخری بار مجھے ۱۴ر جون ۱۹۶۹ء کو مرادآباد میں اپنے جذبات وخیالات کو آپ کے گوش گذار کرنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ تخاطب اس لیے نہیں کہتا کہ میں اس وقت جسمانی طور پر آپ کے درمیان موجود نہ تھا، آج پورے چھ سال کے بعد آپ سے شرفِ مخاطبت حاصل ہو رہا ہے،

انسان فطری طور پر سہولت پسند، پُرامید، رجائی (OPTIMIST) واقع ہوا ہے۔ وہ فطرتاً مسائل، و واقعات کا روشن اور درخشاں پہلو دیکھنے کا عادی بھی ہے اور متمنی بھی، امید وخوشی، فتح وکامیابی، سکون واعتدال، تعمیر وترقی، خیر سگالی وہمدردی، تعاون واشتراکِ عمل، حق وصداقت کا اعتراف اس کے خمیر وضمیر میں ودیعت، اور اس کی فطرت کے سازِ حقیقی نغمے ہیں، اسی جوہرِ انسانیت اور اسی فطری شرافت کی وجہ سے انسانی علوم وفنون، تہذیب وتمدن، نظامِ مملکت اور مذاہب واخلاقیات دنیا میں نہ صرف باقی رہ سکے، بلکہ ان کو پھلنے پھولنے، نئے برگ وبار لانے، اور نئے شگوفے کھلانے کا موقع ملا، اور انسانوں کی بستی مستقل طور پر رزم گاہ اور میدانِ جنگ بننے سے محفوظ رہی، مقابلہ وکشمکش، تلخی وترشی، شکوہ وشکایت، بدگمانی اور بے اعتمادی زندگی کی مجبوریوں اور ناخوشگوار ضرورتوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی، انسانی نفسیات وفطرت کے لیے وہ محض ایک عارضی اور مصنوعی صورت حال ہے، کوئی صحیح الفطرت انسان نہ اس کا قائم و دائم رہنا پسند کرتا ہے اور نہ اس سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔

پھر جب معاملہ اپنے ہی ملک ومعاشرہ کا ہو جس میں بظاہر جینا مرنا اور پھلنا وپھولنا ہے

اور جس سے آئندہ نسلوں کا مستقبل بھی وابستہ ہے، تو وہاں انسان طبعاً یاس وقنوط سے اور بھی زیادہ گریزاں، مقابلہ وکشمکش سے مجتنب، اور اپنے وقت، قوت اور صلاحیت و ذہانت کو منفی و دفاعی اور عارضی و وقتی مسائل پر صرف کرنے میں محتاط ہو جاتا ہے، کسی ملک کی یہ بڑی بدقسمتی اور "سلطانی جمہور" کی بڑی ناکامی ہے کہ آبادی کے ایک بڑے عنصر، اور ایسے عنصر کی جس کی فطری صلاحیتیں ماضی وحال میں ملک کو چار چاند لگا چکی ہیں، اپنے تحفظ و دفاع اور اپنے حقوق کی بازیابی اور جسمانی یا معنوی نسل کشی (GENOCIDE) کے خطرہ سے بچنے میں مصروف ہوں، اس میں اس کی عمر عزیز اور طاقت کے اس ذخیرہ سے جو ایک ملک کی قسمت پلٹ دینے کے لئے کافی ہے، اور جو خالص تعمیری کاموں میں لگنے سے دنیا کے حالات پر بھی اثر انداز ہو سکتا ہے۔ سال دو سال نہیں، پوری چوتھائی صدی لگ جائے، اور اس کے بعد بھی اس کو اپنے تحفظ کا وہ احساس اور مستقبل کی ضمانت کا وہ اعتماد حاصل نہ ہو، جو ایک آزاد جمہوریہ میں ایک آزاد شہری کا سب سے پہلا، اور سب سے بڑا حق ہے اور جس کے بغیر اس ملک کی تمام ترقیاں اور خوشحالیاں، آزادی و جمہوریت ایک سراب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔

اس بنیادی وفطری حقیقت کے پیش نظر میری قدرتی خواہش تھی کہ میں آپ کو اس اسٹیج سے جو آزاد ہند میں مسلمانوں کے تعلیمی مسئلے سے مخصوص ہے، اس غیر فطری اور غیر جمہوری صورت حال کے ختم ہو جانے کی نوید مسرت سناؤں، اور کم سے کم آپ کو یہ بشارت دے سکوں کہ ۳۰ دسمبر ۱۹۵۵ء کو ہم نے اسی ریاست کے ایک ضلع (بستی) سے جو سفر شروع کیا تھا، وہ سولہ برس کے بعد اسی ریاست کے دارالحکومت میں کامیابی اور اطمینان پر ختم ہوا، اب ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت جو اپنے حجم اور معنویت، کمیت و کیفیت میں سب سے بڑی اقلیت ہے جس کو ہم صرف ہندوستان کی دستوری اور آئینی زبان میں، اقلیت کہہ رہے ہیں، ورنہ وہ بہت سے مسلمان ملکوں کی پوری پوری آبادی سے زیادہ تعداد و صلاحیت رکھنے والی ایک ملت ہے، اپنے اس ناگزیر دفاعی فرض سے فارغ ہو چکی ہے، جو اب باب اقتدار کی

کوتاہ نظری اور غلط اندیشی سے ان پر حائل ہوا تھا، اب وہ اپنے محبوب وطن میں اپنے پورے روحانی و ذہنی، اعتقادی اور تہذیبی خصوصیات کے ساتھ جو اس کی شخصیت کا جزو لاینفک ہیں، اور اپنی امنگوں، آرزوؤں کے ساتھ جو ایک آزاد قوم کا فطری حق، اور ایک آزاد ملک کا سب سے بڑا تحفہ اور انعام ہے نہ صرف باقی رہ سکے گی بلکہ ملک کی قیادت و رہنمائی کا فرض بھی انجام دے سکے گی جو کسی فرقے اور آبادی کے کسی عنصر کے ساتھ مخصوص نہیں۔ لیکن سخت افسوس ہے اور قلق ہے کہ میں اور میرے رفقاء اپنے کو اس پوزیشن میں نہیں پاتے، واقعات کی سنگینی اور بے رحم منطق اور حقائق کی بے نیاز و بے لحاظ عدالت اس کی اجازت نہیں دیتی، اور مجھے پھر واقعات سے مغلوب ہو کر غالب کے اس شعر کو سنانا پڑتا ہے جس کو میں نے زیب عنوان بنایا ہے ؎

پھر اُس پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق

سامانِ صد ہزار نمکداں کئے ہوئے

لیکن حضرات! دل کو یہ جراحت دو طرف سے لگی ہے اور دونوں غیر نہیں، اپنے ہیں ایک اپنی حکومت، دوسرے اپنی ملت، حیران ہوں کہ پہلے شکوہ کس کا کروں، میں اپنے ضمیر کے سامنے شرمندہ اور اپنے خدا کے حضور میں خطاکار اور شرمسار بنوں گا، اگر حکومت کے احتسابات کو ملت کے احتساب پر مقدم رکھوں، جس صحیفہ کو میں خدا کا آخری صحیفہ مانتا ہوں وہ کہتا ہے:

اِقْرَأْ كِتَابَكَ ۚ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا

اپنا نامۂ اعمال پڑھو، تمہارے ہوتے ہوئے کسی دوسرے محاسب اور محتسب کی ضرورت نہیں۔

مسلمانوں کے لئے آزادی و اختیاری اور علمی و شعوری طور پر اسلامی عقائد و حقائق اور ابراہیمی و محمدی تہذیب کی خصوصیات و شعائر پر قائم رہنا، ان پر جینے و مرنے کا عزم کرنا اور ان کو اپنے جیتے جی اپنی اولاد و اخلاف تک منتقل کرنا، ان کو ان کی عملی زندگی میں کارفرما اور جلوہ گر دیکھنا اور مرنے سے پہلے ان تعلیمات کے تسلسل اور ان کے نسلاً بعد نسلٍ قائم

رہنے کا اطمینان کر لینا مسلمان کا جزو ایمان، اور اس کے وفادار مسلمان ہونے کی علامت اور پہچان ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جو قرآن مجید کی آیت "وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ٥" (تو دیکھو! دنیا سے نہ جانا مگر اس حالت میں کہ تم مسلم ہو (یعنی خدا کے فرمانبردار ہو) اور " قُوْا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا ٥" (اپنی جانوں اور اپنے گھر والوں کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ) اور ان آیتوں سے بالکل عیاں ہے، جن میں اس ملت کے داعی اول حضرت ابراہیمؑ اور ان کے فرزند اسمٰعیلؑ و اسحاقؑ و یعقوبؑ کی دعاؤں، خواہشوں کوششوں اور نصیحتوں و وصیتوں کا تذکرہ ہے، کہ ان میں سے ہر ایک نے اس اطمینان کا حاصل کرنا ضروری سمجھا کہ ان کی اولاد ان کی آنکھ بند ہو جانے کے بعد بھی توحید خالص، خدا کی بندگی اور دین حق سے وابستگی پر پورے عزم و استقامت کے ساتھ قائم رہے گی، اور اس شمع کو ان کے بعد بھی روشن رکھے گی۔ انھوں نے زبان حال و قال سے بہتے ہوئے آنسوؤں، متکلم نگاہوں، اور سینہ میں حمیت ایمانی کے امنڈتے ہوئے طوفان کے ساتھ یہ بات کہی کہ جب تک ان کو اس بات کا اطمینان حاصل نہ ہوگا اور ان کی اولاد پورے خلوص اور پورے عزم کے ساتھ اس بات کا وعدہ نہ کرے گی، وہ نہ اطمینان کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوں گے اور نہ ان کی پیٹھ قبر سے لگے گی،

وَوَصّٰى بِهَا اِبْرٰهِيْمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ٥ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِيْ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ٥

اور پھر اسی طریقہ کی ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اور (اس کے پوتے) یعقوب نے

اپنی اولاد کو وصیت کی تھی، انھوں نے کہا: اے میرے بیٹو! خدا نے تمھارے لئے اس دین (حقیقی) کی راہ پسند فرمائی ہے، تو دیکھو! دنیا سے نہ جانا مگر اس حالت میں کہ تم مسلم ہو (یعنی فرمانبردار ہو) پھر کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوب کے سرہانے موت آکھڑی ہوئی تھی اور اس نے اپنے بیٹوں کو وصیت کرتے ہوئے پوچھا تھا، میرے بعد کس کی عبادت کروگے؟ انھوں نے جواب دیا: اسی خدا کی جس کی تو نے عبادت کی ہے، اور تیرے بزرگوں ابراہیم، اسمٰعیل اور اسحاق نے کی ہے اور ہم اس کے حکموں کے فرمانبردار ہوئے (سورۃ البقرہ: ۱۳۲-۱۳۳)

اور اس سے پہلے حضرت ابراہیم و اسمٰعیل کی مشترک دُعا گزر چکی ہے، جس میں دونوں (باپ بیٹے) نے کہا، کہ

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ

اے ہمارے پروردگار! (اپنے فضل و کرم سے) ہمیں ایسی توفیق دے کہ ہم سچے مسلم (یعنی تیرے حکموں کے فرمانبردار) ہو جائیں، اور ہماری نسل میں سے بھی ایک ایسی اُمت پیدا کردے جو تیرے حکموں کی فرماں بردار ہو۔ خدایا! ہمیں ہماری عبادت کے (سچے) طور طریقے بتا دے اور ہمارے قصوروں سے درگزر کر، بلاشبہ تیری ہی ذات ہے جو رحمت سے درگزر کرنے والی ہے، اور جس کی رحیمانہ درگزر کی کوئی انتہا نہیں (سورۃ البقرہ: ۱۲۸)

اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل کی یہ تڑپ، اور روح کی بے قراری قرآن میں محفوظ کردی گئی ہے، کہ

وَاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَنْ نَعْبُدَ الْأَصْنَامَ ۝

بار الٰہا مجھے اور میری (جسمانی و معنوی اولاد) اولاد کو (ہر قسم کی) بُت پرستی سے بچائیو۔

جہاں تک ملت اسلامی کا تعلق ہے اور جس کا کنبہ اور خاندان فرانس سے لے کر انڈونیشیا تک پھیلا ہوا ہے، اس کا نام "مسلم" ہی بتلاتا ہے کہ وہ کسی ملک یا کسی قومیت و وطنیت، جہاں تک کہ کسی جلیل القدر پیغمبر اور خود اپنے نبی برحق یا ان کے وطن و شہر یا اس کے خاندان و نسل پر مبنی نہیں۔ دنیا کی ساری مذہبی ملتوں میں جن میں یہودی اور عیسائی بھی شامل ہیں، اسی کا نام اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ اس کا وجود محض ایک عقیدہ، ایک مسلک زندگی، اور ایک عہد و پیمان اور ایک رشتہ وفاداری (اسلام) پر قائم ہے، اس کا دامن مستقل طور پر علم سے باندھ دیا گیا ہے، اور ان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے بلکہ اس کا تصور بھی علم کے بغیر نہیں کیا جا سکتا، اسی کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس کے پیغمبر پر جو پہلی وحی نازل ہوئی اس میں نہ صرف علم، بلکہ اس کے سب سے بڑے وفادار خادم اور ترجمان "قلم" کو بھی فراموش نہیں کیا گیا اور فرمایا گیا:

اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝

پڑھو، اور تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا، اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں جن کا اس کو علم نہ تھا۔ (سورۃ العلق: ۳-۴-۵)

کیا ایسی ملت کے لئے کسی وقت اور کسی جگہ بھی اس کا جواز ہے کہ وہ اپنی بقدر ضرورت دینی واقفیت اور اپنی آئندہ نسل کے شعوری و علمی طور پر اسلام پر باقی رہنے کی جدوجہد اور اس کے تحفظ کے مسئلہ سے زیادہ کسی اور مسئلہ پر اپنی توجہ اور دلچسپی، اپنی سعی و جدوجہد اور اپنی ایثار و قربانی کا اظہار کرے۔ اور اس تعلیمی محاذ پر دفاع اور اقدام، اور ہر اس منفی و مثبت تدبیر کو کام میں نہ لائے جو وقت کا تقاضہ اور مسئلہ کا مطالبہ ہے؟ کم سے کم ہندوستان کی آزادی کے بعد سے جس کو اب پوری چوتھائی صدی ہو گئی اور اس سے بھی احتیاط سے کام لوں تو کہوں گا کہ اس سولہ برس کے عرصہ میں مجھے دینی تعلیمی کونسل کے اسٹیج، اس کی ضلعی و ریاستی کانفرنسوں اور اس کے مؤثر لٹریچر کے

ذریعہ یہ مسئلہ پوری وضاحت کے ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے آگیا ہے کہ ان کو اپنے اور اپنی آئندہ نسل کے دین وایمان کے بچانے، اور اس نسل کا رشتہ اسلام سے قائم رکھنے کی کوشش کا آخری اور فیصلہ کن مرحلہ درپیش ہے، اس کے لئے ان کو آئینی جدوجہد بھی کرنی ہے۔ حکومت کو (جو اس وقت تک کوئی قدم نہیں اٹھاتی جب تک کہ اس کو کسی مطالبہ کے متعلق اس کا اطمینان نہیں ہوجاتا کہ اس کے پیچھے مطالبہ کرنے والوں کے دل کی آواز، اجتماعی فیصلہ، اور ہر طرح کی قربانی کا عزم ہے) اس کی معقولیت کا قائل اور اصلاح حال پر آمادہ کرنا ہوگا، اس کے لئے ان کو اپنے وقت اور سرمایہ کا ایک وافر حصہ صرف کرنا ہوگا، اس کو ان تمام مسائل و مشاغل پر ترجیح دینی ہوگی، جن کو اس مسئلہ سے کچھ بھی نسبت نہیں۔

لیکن کیا واقعات اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے اس مسئلہ کی اہمیت پورے طور پر سمجھ لی ہے؟ کیا انھوں نے سیاسی و اقتصادی مسائل سے قطع نظر اس کو اتنی بھی اہمیت دی ہے، جتنی ان مشاغل کو بھی دے رکھی ہے جو ....

.... بچگانہ وطفلانہ ذہنیت کے مظاہروں سے زیادہ نہیں، کیا اس عرصہ میں جس میں کاتب تاریخ نہیں بلکہ کاتب تقدیر اس ملک میں مسلمانوں کے مستقبل کی پیشین گوئی ثبت کرنا چاہتا ہے۔ انھوں نے کسی سنجیدگی، حقیقت پسندی، واقعات و تجربات سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت اور عام انسانی عقل کا بھی مظاہرہ کیا ہے؟ کیا ان میں کسی بیدار مغز، ہوش گوش رکھنے والی قوم کی علامت پائی جاتی ہے؟ نمود و نمائش میں جو وقت، قوت اور دولت صرف ہوتی ہے اس کا کیا تناسب ہے؟ اور اس کا حالات و حقائق سے کیا جوڑ ہے؟ کیا اس زندہ دلی، جذبۂ مسابقت اور جوش و ولولہ کا جو ان مشاغل میں نظر آتا ہے، کوئی حصہ بھی اس تعمیری ٹھوس، انقلاب آفریں اور حیات بخش کام میں صرف ہو رہا ہے، جس پر مسلمانوں کی بحیثیت ملت ابراہیمی و امت محمدی وجود و بقا کا انحصار ہے۔ ایسے کسی موقع پر جب مسلمان اپنے ان جذبات کی تسکین کا سامان کررہے ہوں، اور دنیا و ہمسایہ قوموں کو یہ تأثر دے رہے ہوں کہ ان سے زیادہ مطمئن، فارغ البال

خوشحالی، مسرور اور شاداں قوم کوئی نہیں، آپ ہندوستان کے اُفق پر ایک ملت کے زوال کی روشن تحریر پڑھ سکتے ہیں، اور یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اس ملت کا جو اپنی عمر کے کھولت کے دور میں ہے، دینی شعور، دماغی سطح، اور افتادِ طبع اس کم سن بچہ کی ذہنیت سے بہتر نہیں، جو گھر پھونک تماشا دیکھنا چاہتا ہے اور جو اپنے مریض جاں بلب باپ کو گھر میں اکیلا چھوڑ کر شہر کا چراغاں اور گاؤں کا میلہ دیکھنے چلا جاتا ہے، بلکہ اس سے ایک قدم آگے بڑھا کر کہتا ہوں کہ اس جاں بلب باپ یا ماں کی دوا کے لئے اسکے پاس جو چند پیسے ہیں، ان کو بھی تماشہ بینی کے شوق، یا اپنے ہمجولیوں کی واہ واہ کے ذوق میں داؤں پر لگا دیتا ہے، ان رونقوں کی حیثیت اس سے کچھ زیادہ نہیں، " وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا"۔

حضرات! جراحتِ دل پر اس سے زیادہ نمک پاشی کی نہ مجھ میں جرأت ہے اور نہ آپ میں تحمل، اگر اس تلخ نوائی میں کچھ بے اعتدالی پیدا ہو گئی ہو تو میں غالب ہی کی زبان میں آپ سے معافی چاہوں گا ؎

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف

آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

اب ذرا جراحتِ دل کے اس شکوہ کو بھی سن لیجئے جس کا تعلق ملک کے انتظامی اداروں اور وطن عزیز کی سب سے با اختیار اور صاحبِ اقتدار جماعت اور حکومت کی مشینری سے ہے۔ ہندوستان کی اقلیتوں، بالخصوص مسلم اقلیت کے تحفظ کی سب سے بڑی ضمانت دستورِ ہند کی آرٹیکل نمبر ۳۰ (دفعہ) کا یہ اعلان تھا کہ " اقلیتوں کو یہ حق ہے کہ وہ اپنے نجی تعلیمی ادارے قائم کریں اور ان کو اپنی مرضی کے مطابق چلائیں"۔ دستورِ ہند کی تصریحات کے مطابق اقلیتوں سے مراد تمام لسانی و مذہبی اقلیتیں ہیں، اور ان کو بغیر کسی شرط و قید کے اپنے نجی تعلیمی ادارے قائم کرنے اور ان کو اپنی پسند کے مطابق چلانے کا حق ہے، ریاستوں کی عدالت ہائے عالیہ اور ہندوستان کی آخری عدالت (SUPERAME COURT) کے فاضل ججوں اور دستورِ ہند کے مستند ترین شارحین کے بیان کے مطابق ان میں وہ تمام ادارے شامل ہیں جو کسی بھی اقلیت، یا اس کے کسی فرد نے قائم کئے ہوں اور ان کے قیام کا مقصد

اقلیتی فرقے کو فائدہ پہنچانا ہو، دستورِ ہند کا یہ اعلان عقلِ سلیم، فطرتِ انسانی اور انسان کے مسلّمہ بنیادی حقوق سے پوری مطابقت رکھتا ہے، اقوامِ متحدہ (جس کا ہندوستان بھی ایک ممبر ہے) نے حقوقِ انسانی کا جو منشور شائع کیا ہے[1]، اس کی دفعہ ۲۶ (۳) میں بالا علان کہا گیا ہے، کہ "والدین کو اس کا سب سے پہلے حق پہونچتا ہے کہ وہ تعلیم کا وہ طریقہ انتخاب کریں جس کے مطابق وہ اپنے بچے کو تعلیم دینا چاہتے ہیں۔" اس لئے حقیقت میں مسئلہ اقلیت اور اکثریت کا نہیں، والدین اور اولاد کا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دستورِ ہند کی یہ دفعہ ایسی منصفانہ، دانشمندانہ اور حقیقت پسندانہ دفعہ تھی، جس پر ہندوستان کے دستور سازوں کو، اور اس ملک کو بجا طور پر فخر کرنے کا حق حاصل ہے، ایسا ایسے ملک میں جو صرف ایک جغرافیائی وحدت ہے، اور اس سے زیادہ اس کو سیاسی وحدت بھی کہہ سکتے ہیں، اور جو تقدیر کے فیصلہ کے مطابق مختلف مذہبی فرقوں، مکاتیبِ خیال، اور رنگارنگ تہذیبوں اور ثقافتوں کا قدیم زمانہ سے مرکز رہا ہے، اور اس نے ان کو نہ صرف رہنے کی اجازت دی ہے، بلکہ پھلنے پھولنے کا بھی موقع دیا ہے۔ اقلیتوں کے لئے اس سے بہتر ضمانت اور اس سے زیادہ محفوظ اور بے خطر راستہ نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان کی تاریخ میں وہ ساعت بڑی مبارک تھی جب اس کے دستور سازوں نے یہ فیصلہ کیا، اور اپنے اس فیصلہ اور عزم کے اظہار کے لیئے یہ قانونی الفاظ جو آسانی سے ہلائے نہیں جا سکتے انتخاب کیئے۔ ہندوستان جیسے ملک کے لئے جو سیاسی انتشار، اقتصادی مسائل، تعلیمی پستی، اور اخلاقی بے تربیتی کے بحرانوں سے دوچار ہے۔ یہی طریقِ کار مناسب تھا، اس کو تمام غیر ضروری کشمکشوں، اور نئے نئے مسائل سے دامن بچا کر اپنی سالمیت و استحکام کی بھرپور کوشش کرنی کرنی چاہیئے تھی، اور خدا کی بخشی ہوئی ذہانت، اور کام کرنے کی مہلت و فرصت پوری احتیاط کے ساتھ انھیں چیزوں پر لگانی چاہیئے تھی، جو ملک کی تعمیر و ترقی اور پیدا ہونے والے مسائل کے حل میں مفید اور کارآمد ثابت ہو سکیں، یہاں اقلیتوں کے دل میں نہ صرف اعتماد، بلکہ گرمجوشی، خوش دلی اور کام کرنے کی توانائی پیدا کرنے کی سب سے زیادہ ضرورت تھی، جو اس کے بغیر نہیں حاصل نہیں ہو سکتی،

(1) CHARTER OF HUMAN RIGHTS

کہ ان کو اپنی خصوصیات کے باقی رہنے کا اطمینان حاصل ہو اور ان کو اپنی روحانی، ذہنی و اخلاقی، نیز تہذیبی و لسانی امنگوں و آرزوؤں کی تکمیل اور اپنے ان خوابوں کی تعبیر پوری ہوتی نظر آتی ہو جو جنگ آزادی کے موقع پر انھوں نے دیکھے تھے۔

لیکن افسوس کا مقام ہے کہ اس ملک کے رہنماؤں کو جن کو نظم و نسق ہی سپرد نہیں ہوا تھا، بلکہ اس ملک کی صورت گری کا نازک کام بھی حوالہ ہوا تھا، اس ملک کے مخصوص حالات کا لحاظ نہیں رہا اور انھوں نے دنیا کے ان ملکوں کی تقلید و نقل ضروری سمجھی، جہاں پہلے سے مذہبی، تہذیبی اور لسانی وحدت پائی جاتی تھی، وہاں تعلیمی وحدت کا نفاذ نہ صرف ممکن تھا بلکہ مستحسن بھی۔ اگرچہ ان ترقی یافتہ ملکوں میں بھی تعلیم کے بہت سے نئے تجربے اور اداروں کی گنجائش اب بھی باقی ہے، ہمارے ملک کے رہنماؤں نے اس بارے میں اس ذہانت، حقیقت پسندی اور عملیت کا ثبوت نہیں دیا جس کی ان سے توقع تھی، اور یہ قوموں، تہذیبوں اور مملکتوں کی تاریخ کا پرانا المیہ ہے کہ بارہا انھوں نے اپنی سیاسی یا فوجی طاقت کے اعتماد پر حقائق سے گریز، اور آبادی کے کمزور طبقوں کے مطالبات سے چشم پوشی کی، یونان و روما، ایران اور خود عرب و ترکی کی سلطنتیں اپنے اپنے دور میں اس غلطی کا شکار ہو چکی ہیں، اور انھوں نے ان اقلیتوں کو غیر مطمئن اور ناراض بنا کر اپنے لئے غیر ضروری مشکلات پیدا کر لیں، ان کی بیجا ضد نے بعض اوقات خود اپنے مقاصد کو بڑا نقصان پہنچایا ہے، اور ملک کی ترقی کو پیچھے ڈال دیا ہے، فرد کے فیصلہ اور اقدام میں ذہانت، اجتہاد، اور حقیقت پسندی کا عنصر اتنی اہمیت اور دور رس نتائج کا حامل نہیں، جتنا قوموں اور مملکتوں کے فیصلے اور اقدام میں، تاریخ کی گواہی ہے کہ افراد ہی ذہانت کی کمی کا شکار نہیں ہوتے، قومیں اور مملکتیں بھی ہوتی ہیں۔ تاریخ افراد کو معاف کر دیتی ہے، قوموں اور مملکتوں کو معاف نہیں کرتی۔

حضرات! عصر حاضر کے عظیم مغالطوں میں سے ایک مغالطہ یہ بھی ہے کہ لسانی، ثقافتی، اور معاشرتی وحدت اتحاد کا سب سے بڑا سرچشمہ، اور ہر مرض کی دوا ہے۔ یہ مقلدانہ ذہنیت ہمارے ملک کے اعلیٰ دانشور طبقے میں بھی گھر کر چکی ہے، اسی بنا پر تعلیمی وحدت کے وہ سب انتظامات کچھ

جاتے ہیں، نجی اداروں کو ختم کرنے کی سفارش کی جاتی ہے، اقلیتوں (خواہ وہ لسانی ہوں، خواہ مذہبی کے قائم کئے ہوئے اداروں کے نظم ونسق کو حکومت کی تحویل میں لینے کے لئے تجاویز پیش کی جاتی ہیں، نجی اداروں کو ختم کردینے اور ان کو حکومت کے انتظام میں لینے کے لئے وہ دانشمندانہ راہیں پیدا کی جاتی ہیں، اور پڑوسی اسکول (NEIGHBOUR SCHOOL) کے حدود کو اتنا وسیع کیا جاتا ہے کہ عملاً کسی اقلیت، کسی فرقہ، اور کسی مذہبی گروہ کو اپنی مرضی، پسند اور عقیدہ ومسلک کے مطابق اپنے جگر گوشوں اور اپنے نسلی، معنوی وارثوں کو بنانے، سنوارنے اور اپنے روحانی وتہذیبی ورثہ کا امین وحقدار بنانے کا موقع نہیں ملتا، اسکی جھلکیاں آپ کوٹھاری کمیشن کی رپورٹ میں آسانی سے دیکھ سکتے ہیں، لیکن یہ محض عصر حاضر کا ایک چلا ہوا مغالطہ ہے کہ ہر طرح کی وحدت حقیقی اتحاد کے لئے ضروری ہے، یہاں تک کہ اب یکساں عائلی قانون یونی فارم (UNIFORM) سول کوڈ (CIVIL CODE) کا نعرہ بھی پورے زور شور سے بلند کیا گیا اور وقتاً فوقتاً وہ سامنے آتا رہتا ہے لیکن واقعات وتجربات، یورپ کی دو خون آشام عالمگیر جنگوں اور ملکوں کی طبقاتی کشمکش نے اس مغالطہ کا پردہ چاک کردیا ہے کہ تہذیبی، معاشرتی حتی کہ مذہبی وحدت بھی اتحاد کی ضامن اور خوشگوار و دوستانہ تعلقات کے لئے کافی ہے۔ سوسائٹی میں جب تک سیاسی برتری کا شوق، ذاتی اغراض، دولت کمانے کا جنون و سرسامی کیفیت، اور اخلاقی پستی موجود رہے گی، خدا شناسی اور خدا ترسی، احترام آدمیت سچی ہمہ گیر اور مثبت حب الوطنی اور اخلاقی تعلیم کا فقدان رہے گا۔ ساری وحدتوں کے باوجود یہ ملک انتشار و تصادم، وحشت و بربریت، منافرت اور ظلم واستحصال کا شکار رہے گا، ایک ہی وحدت کے رشتہ میں پروئے ہوئے افراد آج بھی ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے ہیں، ایک دوسرے کا خون پی رہے ہیں، بھائی بھائی پر ظلم کر رہا ہے، گاؤں والا گاؤں والے کو لوٹ رہا ہے، محلہ والا اپنے پڑوسی پر ظلم کرنے سے دریغ نہیں کرتا، رشوت کا بازار گرم ہے، اور کوئی لسانی، تہذیبی اور تعلیمی وحدت اس کی راہ میں مزاحم، اور اس انسان کشی، ملک دشمنی اور مردم آزاری میں آڑے نہیں آرہی ہے

اس لئے یہ سمجھنا کہ ملک میں اوّل سے آخر تک ایک نصاب و نظام تعلیم جاری ہونے، تعلیم گاہوں کا ایک ہی نظم و نسق قائم ہو جانے، مذہبی و نجی اداروں کے ختم ہو جانے سے ہر درد کا درماں ہو جائے گا، اور وہ حقیقی اتحاد قائم ہو جائے گا، جو اس ملک کو امن و سکون کا گہوارہ، اور حسین و مہکتے ہوئے پھولوں کا گلدستہ بنا دے گا، محض ایک ایسا طریق فکر ہے جس میں اجتہاد کم نقالی زیادہ، عملی تجربہ مفقود، اور تخیل آرائی غالب ہے۔

حضرات! اب اس داستان کو جس میں شکوہ و شکایت کا حصّہ زیادہ ہے، مختصر کرتے ہوئے کہوں گا کہ ایک آزاد جمہوری حکومت کا جس کی بنیاد خالص حب الوطنی، رضا کارانہ جذبۂ خدمت، اور اس مشترک جنگ آزادی پر پڑی ہو جس میں ملک کے تمام شہری، اور اکثریت و اقلیت کے افراد دوش بدوش شریک رہے ہوں، سب سے عظیم و مقدس فرض یہ ہے کہ اس کی آبادی کے تمام عناصر، اور اس کے مختلف فرقوں اور اقلیتوں کو اس ملک میں اپنے اور اپنی نسل کے تحفظ کا پورا احساس اور مکمل اطمینان ہو، کسی حکومت کی ناکامی اور دستور کی خامی کی اس سے بڑھ کر مثال نہیں ہو سکتی، کہ اس ملک کا کوئی شہری تحفظ کے احساس سے محروم ہو، اور واضح رہے کہ ایک حقیقت پسند انسان کی حیثیت سے میں جب تحفظ کا لفظ بولتا ہوں، تو اس سے مراد جسمانی و معنوی، نسلی و روحانی ہر طرح کا تحفظ ہوتا ہے، کہ محض جسمانی تحفظ، جسم و جان کی سلامتی، اور قتل و غارت گری سے حفاظت پر کوئی باشعور، باضمیر، صاحب عقیدہ اور صاحب تہذیب جماعت قانع اور مطمئن نہیں ہو سکتی، ایسا تحفظ تو جنگل کے بعض جانوروں اور پرندوں کے لئے بھی کیا جاتا ہے، اور وقتاً فوقتاً ان کی نسل و نوع کی حفاظت کے لئے سخت قوانین بنائے جاتے ہیں، مجھے معاف کیا جائے، مسلمانوں کا معیار اس بارے میں اور زیادہ بلند، اور ان کی حس اس سلسلہ میں اور زیادہ تیز ہے، اس کا تعلق ان کے مذہبی معتقدات، ان کے اصول زندگی، اور ان کے اس فہم و فکر اور نقطۂ نظر سے ہے، جو دین و دنیا، فوز و فلاح، اور فرد و جماعت کی کامیابی و سعادت کے بارے میں وہ رکھتے ہیں، اس کا تقاضا ہے کہ ایک طرف اس ملک کے مسلمان آئینی جد و جہد کے تمام طریقوں سے کام لے کر اور اجتماعی عزم و فیصلہ کی پوری طاقت سے اس ملک میں اپنے لئے حقیقی اور کامل تحفظ کی فضا پیدا کریں جس کے بغیر مجھے کہنے کی اجازت

دی جائے، کہ وطن وطن نہیں، مسافرت آزادی آزادی نہیں، غلامی، اور گھر اور چمن چمن نہیں قید خانہ اور قفس ہے۔ دوسری طرف حکومت کو بھی اپنے رویّہ اور اس رجحان پر نظر ثانی کرنی چاہیئے جو بجی تعلیمی اداروں کو ختم کرنے اور مختلف فرقوں اور اقلیتوں کو ان کی آزادی" اور ان بنیادی شہری حقوق سے محروم کرنے کی شکل میں جو دستورِ ہند نے ان کو دئے ہیں، نمایاں ہو رہا ہے بلکہ اس سے ایک قدم آگے دستورِ ہند میں تبدیلیوں کا خطرناک قدم بھی اٹھایا جا چکا ہے اور اس طرح اقلیتوں کے لئے وہ آخری پناہ گاہ بھی ختم ہو رہی ہے، جو کسی دستوری اور جمہوری ملک میں پائی جاتی ہے، یہ ملک کو ایسی خطرناک منزل کی طرف لے جانے کا اقدام ہے جس کے تصور سے ایک محبِ وطن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس کی راتوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔ انھیں خطرات کی نشاندہی انھیں حقائق کو واضح اور دل نشین کرنے اور انھیں مقاصد کے حصول کے لئے آخری جد وجہد کرنے کی خاطر یہ دینی تعلیمی کونسل وجود میں آئی، اور اسی عزم سفر کو تازہ اور پختہ، اور اسی پیغام کو وسیع اور مؤثر بنانے کے لئے یہ کانفرنس منعقد کی جا رہی ہے جس میں پہلی مرتبہ اسی ریاست کے دردمند وحساس مسلمان نہیں، دوسری ریاستوں کے زندہ دلی اور بلند نظر اصحاب بھی جن کو مسلمانوں کے تعلیمی مسئلے اور ان کے مستقبل سے دلچسپی ہے، ملک کے دور دراز حصوں سے زحمتِ سفر برداشت کر کے کانفرنس کی شرکت کے لئے تشریف لائے ہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کی صحیح رہنمائی فرمائے اور ہم کو اپنی نصرت سے سرفراز کرے۔

رَبَّنَا آتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ۝

ابوالحسن علی ندوی

مطبوعہ شاہی برقی پریس۔ نعمت اللہ روڈ۔ امین آباد۔ لکھنؤ